

دورِ جدید کا اہم ترین مسئلہ

مذہب کی ضرورت اور اس کا معیار

جنوری کے آخری ہفتہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کانفرنس (جلدِ تقسیم اسناد) کے موقع پر لارڈ لوتھین نے جو خطبہ دیا ہے، وہ درحقیقت اس قابل ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ۔۔۔ جدید اور قدیم دونوں۔۔۔ اس کو گہری نظر سے دیکھیں اور اس سے سبق حاصل کریں۔ اس خطبہ میں ایک ایسا آدمی ہمارے سامنے اپنے دل و دماغ کے پردے کھول رہا ہے جس نے علوم جدیدہ اور انکی پیدا کردہ تہذیب کو محض دور سے نہیں دیکھا ہے، بلکہ خود اس تہذیب کی آغوش میں جنم لیا ہے اور اپنی زندگی کے ۵۶ سال اسی سمندر کی غواصی میں گزارے ہیں۔ وہ بیدار کشی اور خاندانی یورپین ہے۔ آکسفورڈ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ ”راؤنڈ ٹیبل“ جیسے مشہور رسالے کا ایڈیٹر ہے چکا ہے، اور قریب قریب ۲۲ سال سے سلطنت برطانیہ کے مہمات امرو میں ذمہ دارانہ حصہ لیتا رہا ہے۔ وہ کوئی بیرونی ناظر نہیں ہے، بلکہ مغربی تہذیب کے اپنے گھر کا آدمی ہے، اور وہ ہم سے بیان کرتا ہے کہ اس کے گھر میں اصل خرابیاں کیا ہیں، کس وجہ سے ہیں، اور اس کے گھر کے لوگ اس وقت درحقیقت کس چیز کے پیا سے ہو رہے ہیں۔ ایک حیثیت سے یہ خطبہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے سبق آموز ہے، کیونکہ اس سے انکو معلوم ہوگا کہ مغربی علوم اور انکی پیدا کردہ تہذیب نری تریاق ہی تریاق نہیں ہے،

بلکہ اس میں بہت کچھ زہر بھی ملا ہوا ہے۔ جن لوگوں نے اس معجون کو بنایا اور صدیوں استعمال کیا، وہ آج خود آپ کو آگاہ کر رہے ہیں کہ ”خبردار اس معجون کی پوری خوراک نہ لینا، یہ ہمیں تباہی کے کنارے پر پہنچا چکی ہے، اور تمہیں بھی تباہ کر کے رہیگی۔ ہم خود اس وقت تریاقِ خالص کے محتاج ہیں، اگرچہ ہمیں یقین کے ساتھ معلوم نہیں، مگر گمان ضرور ہوتا ہے کہ وہ تریاقِ تمہارے پاس موجود ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے تریاق کو خاک میں ملا کر ہماری اس زہر آلود معجون کے مزے پر لگ جاؤ۔“

دوسری حیثیت سے اس خطبہ میں ہمارے علمبرار اور مذہبی طبقوں کے لیے بھی کافی سامانِ بصیرت ہے۔ اس سے وہ اندازہ کر سکیں گے کہ اس وقت جس دنیا میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے سامنے اسلامی تعلیمات کے کن پہلوؤں کو روشنی میں لانے کی ضرورت ہے۔ یہ دنیا کئی صدیوں سے مادہ پرستی کی تہذیب کا تجربہ کر رہی ہے، اور اب اس سے تھک چکی ہے۔ صدیوں پہلے روحِ تحقیق اور آزادیِ فکر کا جو تریاق ہم نے اہلِ فرنگ کو ہم پہنچایا تھا، اس میں خود انہوں نے محض نادانستگی میں لاد مذہبی اور مادیت کا زہر ملا دیا، اور دونوں کی آمیزش سے ایک نئی تہذیب کی معجون تیار کی۔ اس معجون کا تریاق اپنے زور سے انہیں ترقی کے آسمان پر اٹھائے گیا، مگر اس کا زہر بھی برابر اپنا کام کرتا رہا، یہاں تک کہ اب تریاق پر زہر کا اثر پوری طرح غالب ہو چکا ہے۔ اس کے تیغِ نتائج کو خوب اچھی طرح جھگت لینے کے بعد اب وہ پھر تریاق کی مزید خوراک کے لیے چاروں طرف نظر دوڑا رہے ہیں۔ ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ ان کی معجون میں زہر ہیے اجزاء کون کون سے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان اجزاء کے ملنے سے انکی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے۔ وہ اب یہ بھی صاف طور پر محسوس کر رہے ہیں کہ ان اثرات کو دور کرنے کے لیے کس قسم کا تریاق انہیں درکار ہے، مگر صرف یہ بات ان کو معلوم نہیں ہے کہ جس تریاق کے وہ طالب

ہیں، وہ اسلام کے سوا دنیا میں اور کسی کے پاس نہیں، اور یہ آخری خوراک بھی ان کو اسی دو آقا سے ملیگی جہاں سے پہلی خوراک ملی تھی۔ اس مرحلے تک پہنچ جانیکے بعد بھی اگر وہ تریاق کیسیلے بھٹکتے رہیں، اور اسے نہ پا کر اپنے زہر سے ساری دنیا کو مسموم کیسے چلے جائیں، تو اس گناہِ عظیم میں انکے ساتھ علمائے اسلام بھی برابر کے شریک ہونگے۔ علماء کیسیلے اب یہ وقت نہیں ہے کہ وہ النبیات اور ما بعد الطبیعیات، اور نقیہ جزئیات کی بحثوں میں لگے رہیں۔ رسول اللہ کو علم غیب تھا یا نہ تھا؟ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں؟ رسول اللہ کا نظیر ممکن ہے یا نہیں؟ ایصالِ ثواب اور زیارت قبور کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آئینِ بالچہرہ و رفع یدین کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ مسجد میں منبر و محراب کے درمیان کتنا فاصلہ رکھا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بیسیوں مسائل جن کو طے کرنے میں آج ہمارے پیشوایانِ دین اپنی ساری قوتیں ضائع کر رہے ہیں، دنیا کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، اور انکے طے ہو جانے سے ہدایت و ضلالت کی اس عظیم اشانِ لڑائی کا تصغیبہ نہیں ہو سکتا جو اس وقت تمام عالم میں چھڑی ہوئی ہے۔ آج اصلی ضرورت ان مسائل کے سمجھنے کی ہے جو نا خدا شناسی اور لادینی کی بنیاد پر علم اور تمدن کے صدیوں تک نشوونما پاتے رہنے سے پیدا ہو گئے ہیں۔ ان کی پوری پوری تشخیص کر کے اصولِ اسلام کے مطابق ان کا قابلِ عمل حل پیش کرنا وقت کا اصلی کام ہے۔ اگر علماء اسلام نے اپنے آپ کو اس کام کا اہل نہ بنایا، اور اسے انجام دینے کی کوشش نہ کی تو یورپ اور امریکہ کا جو حشر ہو گا سو ہو گا، خود دنیائے اسلام بھی تباہ ہو جائیگی، کیونکہ وہی مسائل جو مغربی ممالک کو درپیش ہیں، تمام اسلامی ممالک اور ہندوستان میں پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو چکے ہیں، اور ان کا کوئی صحیح حل بہم نہ پہنچنے کی وجہ سے مسلم اور غیر مسلم سب کے سب ان لوگوں کے اگلے سیدھے نئے ہتھمل کرتے چلے جا رہے ہیں جو خود بیمار ہیں۔ اب یہ معاملہ صرف یورپ اور امریکہ کا نہیں بلکہ ہمارے

اپنے گھر اور ہماری آئندہ نسلوں کا ہے۔

ان وجوہ سے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات اور علماء، دونوں لارڈ لوتھین کے اس خطبے کو غور سے ملاحظہ کریں۔ بیچ میں حسب ضرورت ہم مطالب کی تشریح کرتے جا رہے ہیں تاکہ مغز کلام تک پہنچنے میں مزید سہولت ہو۔

لارڈ لوتھین اپنی بحث کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں :

”ایک اور امر تنقیح طلب ہے جسکی طرف آج میں آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ کیا ہندوستان دور جدید کی سائنٹفک اور عقلی تعلیم کے اُس شدید نقصان سے بچ سکتا ہے جس میں یورپ اور امریکہ آج کل مبتلا ہیں ؟

”دو مغرب میں حکمت جدیدہ سے دو بڑے نتیجے رونما ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو اس نے فطرت اور اسکی طاقتوں پر انسان کی درست رس کو بہت زیادہ وسیع کر دیا۔ دوسری طرف اس نے یونیورسٹیوں کے تعلیم پائے ہوئے لوگوں پر سے عموماً ساری ہی دنیا میں متواتر مذہب کے اقتدار کو کمزور کر دیا۔ دنیا کے جدید کی کم از کم اوصی خرابیاں دراصل انہی دو اسباب سے پیدا ہوئی ہیں۔ تہذیب یافتہ آدمی اُن طاقتوں کے نقشے سے بچ رہا ہے جو سائنس نے اس کو فراہم کر دی ہیں۔ مگر اس نے علم اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاق میں مادی ترقی نہیں کی، جو اس بات کی ضامن ہو سکتی تھی کہ طاقتیں انسان کی تباہی کے بجائے اسکی جھلانی کیلئے استعمال ہوں۔“

اس تمہید میں نااضل خطیب نے دراصل انسانی تہذیب و تمدن کے ایک بنیادی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سائنس مجرد سائنس ہونے کی حیثیت سے اسکے سوا کچھ نہیں کرہ

تحقیق و اجتہاد اور تلاش و محسوس کی ایک لگن ہے جس کی بدولت انسان کو عالم طبیعی کی چھپی ہوئی قوتوں کا حال معلوم ہوتا ہے، اور وہ ان سے کام لینے کے ذرائع فراہم کرتا ہے۔ اس علم کی ترقی سے جو نئی طاقتیں انسان کو حاصل ہوتی ہیں، ان کو جب وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرنے لگتا ہے تو یہ تمدن کی ترقی کہلاتی ہے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں بجائے خود انسان کی فلاح کی ضامن نہیں ہیں۔ یہ جس طرح فلاح کی موجب ہو سکتی ہیں اسی طرح تباہی کی موجب بھی ہو سکتی ہیں۔ ہاتھ سے کام کر نیکے بجائے اگر انسان مشین سے کام کرنے لگا، جانوروں پر سفر کر نیکے بجائے اگر ریل اور موٹر اور بحری و ہوائی جہازوں پر دوڑنے لگا، ڈاک پوکیوں کے بجائے اگر تار برقی اور لاسکی سے خبر رسانی ہونے لگی، تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان پہلے سے زیادہ خوشحال ہو گیا۔ ان چیزوں کے بس قدر اسکی خوشحالی بڑھ سکتی ہے اسی قدر اسکی مصیبت اور تباہی بھی بڑھ سکتی ہے، کیونکہ جس دور تمدن میں انسان کے پاس صرف تیر و شمشیر کے آلات تھے، اسکے مقابلہ میں وہ تمدن بدرجہا زیادہ مہلک ہو سکتا ہے۔ جس میں اسکے پاس مشین گین اور زہریلی گیسیں، ہوائی جہاز اور تخت البحر کشتیاں ہوں۔ ترقی علم و تمدن کے موجب فلاح یا موجب ہلاکت ہونی کا تمام تر انحصار اس تہذیب پر ہے جسکے زیر اثر علوم و فنون اور تمدن و حضارت کا ارتقار ہوتا ہے۔ ارتقار کا راستہ، انسانی مساعی کا مقصد، اور حاصل شدہ طاقتوں کا مصرف متعین کرنے والی چیز یہی تہذیب ہے۔ یہی انسان اور انسان کے باہمی تعلق کی نوعیت طے کرتی ہے۔ یہی اجتماعی زندگی کے اصول اور شخصی، قومی اور بین الاقوامی معاملات کے اخلاقی قوانین بناتی ہے۔ اور فی الجملہ یہی چیز انسان کے ذہن کو اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے تیار کرتی ہے کہ علم کی ترقی سے جو طاقتیں اس کو حاصل ہوں انہیں اپنے تمدن میں کس صورت سے داخل کرے، کس مقصد کیلئے

اور کس طرح انکو استعمال کرے، اور مختلف استعمالات میں سے کن کو ترک اور کن کو اختیار کرے۔ عالم طبیعی (Physical World) کے مشاہدات اور قوانین طبیعی کے معلومات بجائے خود کسی اعلیٰ تہذیب کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ کیونکہ انکی رو سے تو انسان کی حیثیت ایک ذی عقل حیوان سے زیادہ نہیں ہے۔ انکی مدد سے صرف وہی نظریہ حیات قائم کیا جاسکتا ہے جو مادیوں کا نظریہ ہے، یعنی یہ کہ انسان کیلئے زندگی بس ہی دنیا کی زندگی ہے، اس زندگی میں اپنی حیوانی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرنا اس کا منہا کے مقصود ہے اور کائنات میں جو تنازع للبقار اور بقائے اصلح کا قانون جاری ہے، اس سے ہم آہنگ بنانا اور گرد و پیش کی تمام مخلوقات کو کچل کر خود سب پر غالب ہو جانا ہی طاقت کا اصل معنی ہے۔ یورپ نے جو تہذیب اختیار کی وہ اسی نظریہ حیات پر مبنی تھی، اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم اور تمدن کی ترقی نے انسان کو جس قدر طاقتیں بہم پہنچائیں وہ سب انسانیت کی فلاح کے بجائے انکی تباہی کے راستہ میں صرف ہونے لگیں۔ اب خود یورپ والوں کو محسوس ہونے لگا ہے کہ ان کو حیوانی تہذیب سے بلند تر ایک انسانی تہذیب کی ضرورت ہے، اور اس تہذیب کی اساس مذہب کے سوا اور کوئی چیز نہیں بن سکتی۔

آگے چل کر لارڈ لوتھین فرماتے ہیں:

”سائنٹفک اسپرٹ (روح تحقیق) نے یہ تو ضرور کیا کہ رفتہ رفتہ پرانے توہمات کو دور کر دیا، علم کے دائرے کو پھیلا دیا، اور اس طرح مردوں اور عورتوں کو ان بہت سی قیود سے آزاد کر دیا جن میں وہ پہلے جکڑے ہوئے تھے۔ مگر اس کے ساتھ اس نے یہ بھی کیا کہ انسان کو روحانی اور مذہبی صداقت کا شدت کے ساتھ جا بجا متنبہ بنا کر چھوڑ دیا اور اس صداقت تک پہنچنے

کا کوئی راستہ فراہم نہ کیا۔ انراہل مغرب کا حال اب یہ ہے کہ وہ بچوں کی طرح تیز رفتاری، اور عجز بہ زانی، اور حواس کی لذتوں کے شوق میں مہنک ہیں، سادہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت ان سے سلب ہو گئی ہے، اور عملاً ان کا کوئی ربط اس لامحدود، انہی وابدی حقیقت سے باقی نہیں رہا ہے، جسے مذہب پیش کرتا ہے۔

وہ مذہب جو انسان کا ناگزیر رہنما، اور انسانی زندگی کو اخلاقی مقصد شرف اور معنویت حاصل ہونے کا واحد ذریعہ ہے، اس کے اقتدار میں زوال آجانے کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مغربی دنیا ان سیاسی سلکوں کی گرویدہ ہو گئی ہے جو نسلی یا طبقاتی بنیادوں پر قائم ہیں اور سائنس کی اُس صورت پر ایمان لے آئی ہے جو محض مادی ترقی کو منہمائے مقصود قرار دیتی اور زندگی کو روز بروز پیچیدہ اور گراں بار بنانے چلی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ آج یورپ کیلئے اپنی روح اور اپنی زندگی میں اُس اتحاد کا پیدا کرنا دشوار ہو رہا ہے جو اس کو موجودہ دور کی سب سے بڑی مصیبت، نیشنلزم سے نجات دلائے۔“

اس کے بعد لارڈ لوتھین نے ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے

یہ سوال پیش کیا ہے :-

”دیکھا ہندوستان کے دو بڑے مذہب، ہندو ازم اور اسلام، جدید دور کی تنقیدی اور تحقیقی روح کا مقابلہ، مغرب کی مذہبی مصیبت کی بہ نسبت زیادہ کامیابی کیساتھ کر سکیں گے؟ یہ اہم ترین سوال ہے، اور اگر ہندوستان

کو ان مصائب سے بچانا ہے جو مغرب پر نازل ہو چکے ہیں، تو اس ملک کے علمی اور مذہبی لیڈروں کو اسی سوال پر اپنی توجہ مرکوز کر دینی چاہیے۔ اس میں تو شک نہیں کہ روح تحقیق رفتہ رفتہ تو صائم اور جاہلیت کے ان عناصر کو فنا کر دیگی جو اب تک ہندوستان کے عوام میں پھیلے ہوئے ہیں، اور یہ بہت اچھا ہوگا، مگر کیا یہ چیز ان دونوں مذاہب کے اصول اخلاق و روحانیت کو بھی ان لوگوں کے دل و دماغ سے نکال دیگی جو آگے چل کر ہندوستان کی سیاسی، تمدنی اور صنعتی زندگی کے لیڈر بننے والے ہیں؟ مینڈ ازم اور اسلام کی اندرونی زندگی سے واقفیت کا مدعی نہیں ہوں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایسے عناصر رکھتے ہیں جو ان میں سے ہر ایک کو یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے مردوں اور عورتوں پر قابو رکھنے کے قابل بنا سکیں گے، اگرچہ عیسائیت کی بعض ایسی غلط اعتقادی بندشیں اس میں ناکام ہو چکی ہیں جنہوں نے اس مذہب کے جلیل القدر بانی کی پیش کردہ صداقتوں کو چھپا لیا۔“

جیسا کہ لارڈ لوتھین نے خود اعتراف کیا ہے، حقیقتہً ان کو ہندو ازم اور اسلام کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ انہوں نے محض دور سے دیکھ کر چند چیزیں ہندو مذہب میں اور چند اسلام میں ایسی پائی ہیں جو ان کے نزدیک جدید تنقید و تحقیق کی روح کے مقابلہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کو اخلاق و روحانیت کے بلند تر اصولوں پر قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن جو لوگ ان دونوں مذاہب، بلکہ ہندوستان کے تمام مذاہب کا اندرونی علم رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ روح تنقید و

تحقیق کے مقابلہ میں اگر کوئی مذہب طے کر سکتا ہے، بلکہ صحیح تر افاضائیں، اگر کوئی مذہب اس روح کیساتھ اپنے پیروں کو لیکر آگے بڑھ سکتا ہے، اور ترقی و روشنی کے دور میں پوری نوع انسانی کا مذہب بن سکتا ہے، تو وہ اسلام کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ مسیحیت کیوں ناکام ہوئی؟ صرف اس وجہ سے کہ وہ کوئی اجتماعی مسلک نہیں ہے بلکہ اجتماعیت کی مین نفی ہے۔ اس کو صرف فرد کی نجات سے بحث ہے، اور اسکی نجات کا راستہ بھی اس نے یہ تجویز کیا ہے کہ وہ دنیا سے منہ موڑ کر اپنا رخ آسمانی بادشاہت کی طرف پھیر لے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یورپ کی قوموں نے دنیوی ترقی کے راستہ پر قدم بڑھایا تو مسیحیت انکی مددگار ہونے کے بجائے مزاحم ہوئی، اور انہیں اسکی بندشیں توڑ کر آگے بڑھنا پڑا۔ اسی سے ملتا جلتا حال ہندو ازم کا بھی ہے۔ اس کے پاس بھی کوئی ترقی پرورد فلسفہ اور کوئی عقلی قانون اخلاق اور کوئی وسعت پذیر نظام اجتماعی نہیں ہے۔ سب سے بڑی طاقت جس نے ہندوؤں کو ایک سوشل سٹم میں باندھ رکھا ہے، اور دوسری تہذیبوں کا اثر قبول کرنے سے روکا ہے، وہ ان کا ورثہ آئرم (Caste System) ہے۔ مگر موجودہ دور کی روح تنقید و تحقیق کے سامنے اس بندھن کا ٹوٹنا یقینی ہے اور یہ ٹوٹ کر رہیگی۔ اسکے بعد کوئی چیز بند و سوسائٹی کو ٹوٹنے سے نہ بچا سکیگی، اور اسکے متغزل دروازے، بیرونی اثرات کے لیے چھوٹ کھل جائینگے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہندوؤں کے قدیم قوانین معاشرت و تمدن، اور ان کے پرانے بت پرستانہ توہمات، اور ان کے غیر عقلی اور غیر علمی فلسفیانہ قیاسات، دور جدید کی علمی ترقی اور اجتماعی بیداری کے سامنے نہیں ٹھیکر سکتے۔ اب ہندو روز بروز ایک ایسے دور سے کے قریب پہنچتے جا رہے ہیں جہاں انکی اور بڑی حد تک ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ یا تو وہ اسلام کے خلاف اسی نغصب میں گرفتار رہینگے

جس میں یورپ کی نشاۃِ جدید (Renaissance) کے موقع پر سچی اہل یورپ گرفتار تھے، اور اسی طرح اسلام سے مغرب ہو کر مادہ پرستانہ تہذیب کا راستہ اختیار کرینگے جس طرح اہل یورپ نے اختیار کیا۔ یا پھر فوج و رفوج اسلام میں داخل ہوتے چلے جائینگے۔

اس فیصلہ کا انحصار بڑی حد تک مسلمانوں اور خصوصاً ان کے قدیم و جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے طرز عمل پر ہے۔ اسلام محض اپنے نام سے تو کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا۔ اسکے اصول اگر محض کتاب میں لکھے رہیں تو ان سے بھی کسی معجزے کا صدور ممکن نہیں۔ جس انتشار اور بے عملی کی حالت میں مسلمان اس وقت مبتلا ہیں، جو جو انکے علماء پر طاری ہے، اور جس زمانہ انفعال و تاثر کا اظہار انکی نئی تعلیم یافتہ نسلوں سے ہو رہا ہے، اس سے ہندوستان کی روح کا فتح ہونا تو درکنار، یہ بھی توقع نہیں کی جاسکتی کہ اسلام کے نام لیوا خود اپنی جگہ ہی پر قائم رہ جائینگے۔ انقلاب کے تیز رو سیلاب میں کسی جماعت کا ساکن کھڑا رہنا غیر ممکن ہے۔ یا اس کو رو میں بہنا پڑیگا، یا پوری مردانگی کیساتھ اٹھ کر سیلاب کا منہ پھیر دینا ہوگا۔ یہ دوسری صورت صرف اسی طرح رونما ہو سکتی ہے کہ اول تو عام مسلمانوں کی اخلاقی حالت درست کی جائے اور ان میں اسلامی زندگی کی روح بیونک دی جائے۔ دوسرے علماء اسلام اور نئے تعلیم یافتہ مسلمان مل کر اصول اسلام کے مطابق زندگی کے جدید مسائل کو سمجھیں اور عملی و عملی دونوں صورتوں میں ان کو اس طرح حل کر کے بتائیں کہ اندھے تعصبین کے سوا ہر معقول انسان کو تسلیم کرنا پڑ جائے کہ ایک ترقی پذیر تمدن کیلئے اسلامی تہذیب کے سوا اور کوئی اساس صحیح اور بے عیب نہیں ہو سکتی۔

ہندوستان میں مذہب اور سائنس کی نزاع کا وہ تصور اب تک چلا جا رہا ہے

جو یورپ میں اب سے پچاس سال پہلے تھا۔ لیکن یورپ میں نقشہ بدل چکا ہے اور یورپ کا پس خوردہ کھانے والے ہندوستان میں بھی عنقریب یہ نقشہ بدل جانے والا ہے، لہذا وہ وقت قریب آ رہا ہے جب ”مذہب“ کے خلاف کم از کم علمی و عقلی حیثیت سے یہ تعصب باقی نہ رہے گا، بشرطیکہ ہم اس وقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے پہلے سے تیار ہوں۔ اس حقیقت کی طرف لارڈ لوتین نے مختصر الفاظ میں یوں اشارہ کیا ہے :-

دو سالہ برٹش پہلے سائنس اور مذہب میں ایسا معرکہ جاری تھا جس کے ختم ہونے کی کوئی توقع نظر نہ آتی تھی۔ زندگی کے روحانی تصور اور مشینی تصور کے درمیان ایسی جنگ برپا تھی جس کے متعلق شبہ ہوتا تھا کہ یہ دونوں میں سے کسی ایک کی موت سے پہلے ختم نہ ہوگی۔ مگر آج دونوں فریقوں نے ڈگیں ڈال دی ہیں۔ نہ سائنس واں، اور نہ وسندار، دونوں میں سے کوئی بھی تاج اُس تحکم کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اس نے کائنات کا معرکہ لڑ لیا ہے، بلکہ درحقیقت دل میں دونوں کے یہ شبہ پیدا ہو چکا ہے کہ آیا وہ اس معرکہ کے متعلق کچھ جانتے بھی ہیں یا نہیں۔ لہذا اب ایک ایسے امتزاج کا امکان پیدا ہو چکا ہے جو تحقیق علمی کے نئے نئے زور شور میں غیر ممکن نظر آتا تھا۔“

لارڈ لوتین بہر حال مذہب کے مسیحی تصور سے آزاد نہیں ہیں، اور مذہب کا وہ عقلی تصور ان تک پہنچا ہی نہیں ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے، اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہی سوچ سکتے ہیں کہ مذہب اور سائنس میں اب کوئی امتزاج ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم مذہب و سائنس کے امتزاج کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو حقیقی

مذہب وہ ہے جو سائنس کی روح، اسکی رہنمائی طاقت بن جائے۔ اسلام درحقیقت ایسی ہی مذہب ہے، اور آج اس کو سائنس کی روح بننے سے اگر کوئی چیز روکے ہوئے ہے تو وہ اس کا اپنا اندرونی نقص نہیں ہے، بلکہ اس کے علمبرداروں کی غفلت، اور موجودہ سائنس کے علمبرداروں کا جہل اور جاہلانہ تعصب ہے۔ یہ دو اسباب بڑے ہو جائیں۔ پھر یہ سائنس کے قالب میں جان ہی بن کر رہے گا۔

آگے چل کر فاضل خطیب نے اس امر پر بحث کی ہے کہ موجودہ دور کی علمی بیداری اور عقلی تنقید کے سامنے کس قسم کا مذہب ٹھہر سکتا ہے؟ انسان اس روشنی کے عہد میں جس مذہب کا طلبگار ہے اسکی خصوصیت کیا ہونی چاہئیں؟ اور اس وقت انسان کی اصلی حاجات کیا ہیں جن کیلئے وہ مذہب کی رہنمائی ڈھونڈ رہا ہے؟ یہ اس خطبہ کا سب سے زیادہ قابل توجہ حصہ ہے۔

دو اگر میں صورتِ حال کا غلط اندازہ نہیں کر رہا ہوں، تو یہ حقیقت ہے کہ جو امتحان اس وقت مذہب کو درپیش ہے، اس سے وہ صرف اسی صورت میں کامیابی کیساتھ گزر سکتا ہے، جبکہ نوخیز نسل، اُسکے اندرونی نظام کی جارح پڑتال کر کے اس امر کا پورا اطمینان حاصل کرے کہ زندگی میں جن عملی مسائل اور جن پریشانیوں اور پیمچیدگیوں سے اس کو سابقہ پڑ رہا ہے ان کا بہترین حل اس مذہب میں موجود ہے۔ شخصی مذہب کا دور اب گزر چکا ہے۔ محض جذباتی مذہب کی بھی اب کسی کو حاجت نہیں۔ اس قسم کے مذہب کا زمانہ بھی اب نہیں رہا جو فرد کو صرف اس حد تک تسلی اور سہارا دے سکتا ہو کہ اسکے اخلاقی طرز عمل کیلئے کچھ ہدایات دیکے، اور ایک ایسی نجات کی امید دلا دے جس کا حال مرنے کے بعد ہی کھل سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کا سائنٹفک آدمی

تو ہر چیز کو، حتیٰ کہ خود صداقت کو بھی بین نتائج کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھنا چاہئے۔ اگر اس کو مذہب کا اتباع کرنا ہے، تو وہ مطالبہ کرتا ہے کہ مذہب اسکو یہ بتائے کہ وہ اسکی زندگی کے عملی مسائل کا اپنے پاس کیا حل رکھتا ہے۔ بہت سے جنموں کے بعد آخر کار نروان حاصل ہونے کی امید، یا موت کے درد آرزو سے گزر جانیکے بعد آسانی بادشاہت میں پہنچ جانے کی توقع ایسی چیز نہیں ہے کہ صرف اسی کی بنیاد پر وہ مذہب کو قبول کرے۔ اسکی فلسفیانہ جستجو کیلئے مذہب کے سب سے پہلے تو وہ کلید فراہم کرنی چاہیے جس سے وہ کائنات کے معنی کا کوئی قابل اطمینان حل پاسکے۔ پھر اسے ٹھیک ٹھیک سا کٹھنک طریقہ پر عملت اور معلول، سبب اور نتیجہ کا بین تعلق ثابت کرے، ہوئے یہ دکھانا چاہیے کہ انسان اُن طاقتوں کو کس طرح قابو میں لائے جو اس وقت بے قابو ہو کر نوع انسانی کو فائدہ پہنچانے کے بجائے تباہ کر دینے کی دھمکیاں دے رہی ہیں، اور کس طرح وہ بے روزگاری، غیر معقول عدم مساوات، ظلم و ستم، معاشی لوٹ، جنگ، اور دوسری اجتماعی خرابیوں کا اندازہ کرے، اور افراد کی باہمی کشش اور خاندانی نظام کی برابری کو کس طرح روکے جس نے انسان کی مسرتوں کا خاتمہ کر دیا؟۔

انسان آج صرف اس وجہ سے مذہب کی طرف دیکھ رہا ہے کہ سائنس نے اسکی مشکلات کو حل کرنے کے بجائے اور زیادہ بڑھا دیا، اسیلئے وہ مذہب سے اپنے شکوک اور اپنی مشکلات کا حل طلب کرنے میں اتنا بے چین ہے جتنا اس سے پہلے کبھی تھا۔ اب اگر مذہب اپنے مقام کی حفاظت اور اپنے کھوئے ہوئے میدان کی بازیافت چاہتا ہے، تو اسے ان سوالات کا روحانی مگر سائنٹیفک جواب دینا چاہیے جسکی صحت کو نتائج کے معیار پر اسی دنیا میں جانچا اور پرکھا جاسکے، موت کے بعد دوسری دنیا پر نہ اٹھا

رکھا جائے۔ ہم اہل مغرب جانتے ہیں کہ یہ سب سے بڑا سوال ہے جو ہمارے اس دور میں سامنے آیا ہے۔ کیا آپ ہندوستان میں اس کا جواب دے سکتے ہیں؟“

لارڈ لوتھین کی تقریر کا یہ حصہ پڑھتے وقت بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پیاسا ہے جسے پانی کا تو علم نہیں، مگر وہ اپنی پیاس کی کیفیات کو ٹھیک ٹھیک محسوس کر رہا ہے اور بتانا جانتا ہے کہ میرے جگر کی آگ کوئی ایسی چیز مانگتی ہے جس میں یہ اور یہ صفات موجود ہوں۔ اگر پانی اسکے سامنے لا کر رکھ دیا جائے تو اسکی فطرت فوراً پکار اٹھے گی کہ جس چیز کا وہ پیدا ہے وہ یہی چیز ہے، اور وہ پیک کر لے۔

مذہب سے لگا لیگا۔ یہ حال صرف ایک لارڈ لوتھین ہی کا نہیں ہے، بلکہ یورپ اور امریکہ اور تمام دنیا میں جو لوگ موجودہ تہذیب و تمدن کی گرمی سے خوب تپ چکے ہیں، اور جو فلسفہ و سائنس کے محور میں کنارے کی شادابیوں سے گزر کر وسط کی بے آب گیاہ پہنائیوں تک پہنچ چکے ہیں، ان سب کے آج بھی پیاس محسوس ہو رہی ہے اسب انہی صفات کی ایک چیز مانگ رہے ہیں جس کا ذکر لارڈ لوتھین نے کیا ہے، اور ان سب کا یہی حال ہے کہ پانی کا نام نہیں جانتے، یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کہاں پایا جاتا ہے۔

مگر وہ رہ کر پکارتے ہیں کہ

جگر کی آگ مجھے جس سے وہ شے لا!

پانی کا نام انہوں نے سنا تو ضرور ہے مگر اس نام سے یہ محض ایسے گھبراتے ہیں کہ اصل شے کو انہوں نے خود دیکھا نہیں، اور اپنے جاہل و متعصب اسلاف سے سنتے چلے آئے ہیں کہ خبردار پانی کے پاس نہ پھینکنا، یہ ایک بڑی زہریلی چیز کا نام ہے۔ لیکن اب یہ اس مرحلے پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر نام کو چھپا کر نفس شے کو انکے سامنے رکھ دیا جائے تو بے اختیار کہہ دینگے کہ ہاں! ٹھیک ہی وہ چیز ہے جسکے نام پیاس سے ہیں۔ پھر جب انہیں بتایا جائیگا کہ حضرت ایہ وہی ”پانی“ ہے جسکے نام سے آپ گھبراتے تھے تو حیرت ان کا منہ کھلا رہ جائیگا، اور کہیں گے کہ کیسا دھوکا تھا جس میں ہم مبتلا تھے۔

دو موجودہ زمانے کا سائنٹفک آدمی "عیسائیت کو خوب چکھ اور پکھ کر دیکھ چکا ہے اور یہ بات اس کی روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ وہ اسکے مرض کی دوا نہیں ہے۔ ہندو ازم اور بودھ ازم کے خیالی فلسفوں اور انکی تاریخی قدامت کو دیکھ کر وہ کبھی کبھی ان سے مسحور ہو جاتا ہے، مگر سائنٹفک تنقید و تحلیل کے پہلے ہی امتحان میں انکی ناکامی کھل کر رہتی ہے۔ بودھ مت تو قریب قریب عیسائیت کا ہندوستانی ایڈیشن ہے۔ رہا ہندو ازم تو وہ خود ان مشکلات اور ان پیچیدگیوں کو پیدا کرتا ہے جن سے نکلنے ہی کیلئے موجودہ زمانے کا سائنٹفک آدمی مذہب کی ضرورت محسوس کر رہا ہے۔ انسان اور افسان میں غیر معقول نامساوی سب سے زیادہ اسکی دائرہ میں پائی جاتی ہے۔ معاشی لوٹ کی سب سے بدتر صورت، یعنی خرید و فروخت اور اسکے سسٹم کا ایک غیر منصف جزو بن چکی ہے۔ جنگ کی اصلی وجہ یعنی انسان کی نسلی تقسیم اور نسلی منافرت اسکی عین اساس میں پیوست ہے۔ اجتماعی زندگی کیلئے جو نظام اس نے قائم کیا ہے وہ انسانوں کو ملانے والا نہیں بلکہ بے شمار طبقوں اور گوتروں میں تقسیم کرنے والا ہے۔ اسکے قوانین معاشرت اتنے پیسیدہ ہیں کہ موجودہ علمی و عقلی بیداری کی دور میں خود ہزاروں برس کا خاندانی ہندوؤں کو توڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں، کیونکہ انکی بنیاد علم اور عقل پر نہیں بلکہ تعصب اور توہمات پر ہے۔ ان دنیوی مسائل سے اوپر، اخلاقیات اور اہلیات کے دائرے میں وہ اس سے بھی زیادہ ناقص پایا جاتا ہے۔ کائنات کے معنی کو اطمینان بخش طریقے پر حل کرنے کیلئے اسکے پاس کوئی کلید نہیں۔ اس کے عقائد ازغانی عقائد ہیں، سائنٹفک ثبوت ان میں سے کسی چیز کا نہیں دیا جاسکتا۔ اخلاقیات میں وہ دل خوش کن مفروضات کا ایک مسلم ضرور بناتا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر اہل مسلم مہاتما گاندھی بنا رکھا ہے۔ مگر معقولات اور حکمت عملی (Practical Wisdom) سے اس کا دامن خالی ہے۔ موجودہ علمی بیداری کے دور میں اسکی ناکامی اگر نہیں کھلی ہے تو عنقریب کھل جائیگی۔

اسکے بعد میدان میں صرف اسلام رہ جاتا ہے، اور وہی ان معیاروں میں سے ایک ایک معیار

پر پورا اترتا ہے جو آج کل کا "سائنٹفک آدمی" اپنے مذہبِ مطلوب کے لیے پیش کر رہا، یا کر سکتا ہے۔ یہ بات کہ مذہب محض ایک شخصی معاملہ ہے، اور محض انفرادی فہمیر ہی اس کا تعلق ہے، اب ایک فرسودہ بات ہو چکی ہے۔ یہ انیسویں صدی کی بہت سی خام خیالیوں میں سے ایک تھی، جسے بیسویں صدی کی اس جو محقق دہائی میں بھی ہندوستان کے بعض وہ قدامت پسند اب تک لٹے جا رہے ہیں جو ادعا کرتے ہیں کہ باوجود ہمیشہ دنیا سے پچاس برس پیچھے چلنے کے خوگر ہیں۔ اب قریب قریب یہ بات لم ہو چکی ہے کہ فرد کا تصور جماعت، الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شخص دوسرے کیساتھ بے شمار چھوٹے بڑے تعلقات میں جکڑا ہوا ہے، اور سوسائٹی من حیث المجموع ایک جسم کا حکم رکھتی ہے جس میں افراد کی حیثیت زندہ جسم کے اعضاء کی سی ہے۔ مذہب کی ضرورت اگر ہے تو وہ صرف فرد کو اپنے فہمیر کے اطمینان اور اپنی نجات بعد الموت ہی کیلئے نہیں ہے، بلکہ پوری جماعت کو اپنی تنظیم اور اپنی دنیوی زندگی کے سسٹم کا روبرو چلائیے ہے، اور اگر اس چیز کی ضرورت نہیں ہے، تو فرد کو بھی نہیں اور جماعت کو بھی نہیں۔ یہ تصور سراسر ایک طفلانہ تصور ہے کہ اجتماعی زندگی کا نظام کچھ اور ہو، اور اس نظام سے بے تعلق ہو کر افراد کے مذہبی عقائد اور ان کے مذہبی اعمال کچھ اور ہوں۔ مذہبی عقائد اور مذہبی اعمال کا کوئی ربط اگر اجتماعی زندگی سے نہ ہو تو ایسے عقائد اور اعمال محض بیکار ہیں، اور صرف بیکار ہی نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے اجتماعی نظام میں ان کا مضحکہ خیز ہونا یقینی ہے جس کے دوسرے اجزاء کیساتھ وہ تعامل (Interaction) قبول نہ کرتے ہوں۔ ہذا دو صورتوں میں لامحالہ کوئی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔ یا تو پوری جماعت کا نظام سراسر لامذہبی ہو اور مذہب کو قطعی طور پر انسان کی زندگی سے خارج کر دیا جائے، جیسا کہ اشتراکیوں کا مسلک ہے۔ یا پھر اجتماعی نظام پورا پورا مذہبی ہو، اور علم اور تمدن دونوں کیلئے مذہب کو رہنما تسلیم کیا جائے، جیسا کہ اسلام کا مقصد ہے۔ پہلی صورت کا تجربہ دنیا بہت طویل مدت تک کر چکی ہے۔ اس سے

دوبی کر دے پھل پیدا ہو سکتے تھے، دوبی پیدا ہوا، اور دوبی آئندہ بھی پیدا ہونگے جبکہ ذرا کر ڈلو تھیں نے کیا ہے۔ اربنہ کی بنیاد صرف دوسری ہی صورت میں ہے، اور اس کے برعکس کارآنہ کے مواقع روز بروز زیادہ پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

مگر جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، ان مواقع سے فائدہ اٹھانا یا انکو ہمیشہ کیلئے کھودینا، مسلمانوں کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ واقعات کی رفتار، دنیا کو — اور دنیا کا ایک جزو رچھوئی حیثیت میں ہندوستان کو بھی — ایک ایسے مقام پر لے آئی ہے جہاں وہ اسلام کی طرف بھی مڑ سکتی ہے، اور ناقہ پرستی اور فساد اخلاق کے اٹھنا سنا لینے کی طرف بھی۔ طبعاً اس کا رخ ابھی تک دو طرف راستے کی طرف ہے، کیونکہ اسی راستہ پر وہ ایک مدت و راز سے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اگرچہ اس راستہ میں ہالک کچھ دیکھ کر وہ ہم رہی ہے، اور چاروں طرف گھبرا گھبرا کر دیکھتی ہے کہ کوئی بچاؤ کی راہ بھی ہے یا نہیں۔ مگر بچاؤ کی راہ خود اسکی اپنی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ وہ درحقیقت اس وقت ایسے لیڈروں کی محتاج ہے جو قوت کیساتھ اٹھ کر اسکی نگاہوں پر پردہ اٹھادیں اور اسلام کی اصلاح و تنظیم کا واحد راہ نجات ہونا ثابت و مبرہن کر دیں۔ ایسی ایک نئی جگہ اور مجتہد جہاد اگر مسلمانوں میں پیدا ہو جائے تو مسلمان تمام دنیا و دنیا امام اور شیوا بن سکتے ہیں، انکو دوسرا مقام عزت پر حاصل ہو سکتا، جس پر وہ کبھی سزاوار تھے اور جس پر مغربی قوموں کو شکر دیکھ کر راج ان منہ میں پانی بھرا چلا آ رہا ہے۔ لیکن اگر اس قوم کے جہاد میں طرح دوں ہمتی حوصلگی کیساتھ بیٹھے رہے، اگر اسکے فرعون پر بھی غیروں کا پریشانی کھانے کو اپنا سنتھا کمال سمجھتے رہے، اگر اسکے علماء اپنی اپنی پرانی فقہ و کلام کی فرسوخ و خور میں اچھے رہے، اگر اسکے لیڈر اور سیاسی پیشواؤں کی ذلیل ذہنیت کا ہی حال رہا کہ شکر اعیانہ کے چھپے لگ چلنے کو جہادنا فریضت کا بلند ترین مرتبہ سمجھیں اور بیسیوں کی سب سے بڑا فریب میں اپنی قوم کو مبتلا کرنا کمال سمجھیں، تو جہاد کی فریضت، فرض اگر اس قوم کے دست پاسے لیکر دل و دماغ تک سب کے تسلسل یا خام کاری ہی میں گرفتار رہیں اور اس کو روک کر انہو سے چند مردان خدا بھی جہاد و اجتہاد فی سبیل اللہ کیلئے کر بانڈ کرنا ٹھ سکیں، تو پھر